میرے ناچیز، ابتدائی مطالعہ کا سفر

کتاب زندگی کا ایک ناتمام ورق!

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی☆
ڈائریکٹر مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد!

النخیل کے مطالعہ نمبر کے لئے آں مکرم کا پیام، پھر اطلاع پھر تقاضے اور تفصیل موصول ہوئی، میں اس کے علاوہ کیا لکھوں، کیا عرض کروں۔

نہ گلم نہ برگِ سبزم، نہ درختِ سایہ دارم — بہ حیرتم کہ فاضلاں را، چہ کارز کشتِ مارا

میں نہ عالم، نہ اس لائق کہ اہل قلم میں شمار کیا جاؤں، ایک چھوٹا سا گوشہ نشین طالب علم سا ہوں، کبھی کبھی کچھ لکھ لیتا ہوں، پڑھ لیتا ہوں اور بس!

بہر حال آں مکرم و محترم کی فرمائش کی تعمیل میں، چند سطور لکھنے کی کوشش کروں گا۔

☆.....علم اور کتاب! میرے بچپن بلکہ آغاز شعور سے کوئی وقت، کوئی دور ایسا نہیں گذرا جب ان کی کچھ آوازیں کانوں میں نہ پڑی ہوں اور آنکھوں سے ان کے بعض متعلقات کا کچھ مشاہدہ نہ کیا ہو۔ مجھے بہت بچپن کی بات یاد ہے کہ میری والدہ مرحومہ، اکثر مغرب کے بعد اور کبھی کبھی عشاء کے بعد بھی ہم بہن بھائیوں کو اس وقت تک ہم دو ہی بہن بھائی تھے) جو چھوٹے چھوٹے تھے، لے کر بیٹھ جاتیں اور لالٹین کی روشنی میں (اس وقت ہمارے گھر میں بجلی نہیں تھی) کوئی کتاب سنایا کرتی تھیں، یہ علامہ یافعی کی مشہور تالیف "روض الریاحین" کا اردو ترجمہ "نزہۃ البساتین" تھا، جو

☆تاریخ پیدائش: ۱۰ ربیع الاوّل ۱۳۷۰ھ مطابق ۲۰ دسمبر ۱۹۵۰ء آبائی وطن: کاندھلہ، ضلع مظفر نگر مادرِ علمی وفراغت: جامعہ مظاہر علوم سہارنپور، سنِ فراغت: ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۹۷۰ء، تصانیف: قاسم العلوم مولانا قاسم نانوتوی حیات وخدمات، سوانح حیات مولانا مظہر نانوتوی، رسائل حاجی امداد اللہ مہاجر مکی و رشید احمد گنگوہی وغیرہ، مناصب: ڈائریکٹر مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ، ضلع مظفر نگر

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی ہدایت ونگرانی میں ہوا تھا اور سب سے پہلے کانپور کے کسی مطبع سے چھپا تھا، اس میں اولیاء اللہ اور بزرگوں کے نہایت مؤثر، پرلطف اور سبق آموز واقعات کثرت سے درج ہیں۔ جس میں بعض ایسے پرکیف وپرسوز ہیں کہ والدۂ مرحومہ، ان کو پڑھتے ہوئے گلوگیر ہوجاتی تھیں اور ظاہر ہے ہم لوگوں پر بھی اس کا کچھ نہ کچھ اثر ہوتا تھا۔ ایک اور کتاب جس کو وہ کثرت سے پڑھتی تھیں، سید اولاد علی لکھنوی کی مشہور لیکن مفقود تالیف "محاربات اسلام" تھی۔ یہ مثنوی کے انداز میں عہد صحابہ کے واقعات خصوصا جنگوں اور اس پر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور مجاہدین کے غیر معمولی لیکن نہایت جانفشانی اور جرأت وصلابت کے واقعات نظم کیے گئے ہیں، ان میں سے ہر ایک واقعہ، اپنے آپ میں ایک نمونہ اور یادگار ہے۔(۱)

اس کے علاوہ حکایات الصالحین اور بہارِ خلد جو شمائل ترمذی کا اردو میں منظوم ترجمہ ہے (تالیف: مولانا کفایت علی

---

(۱) یہ کتاب بالکل دستیاب نہیں گویا معدوم ہے۔ چوں کے اس کے پڑھنے اور انداز بیاں سے پڑھنے، سننے والوں میں ایک جذبہ بیدار ہوتا ہے، ایک حوصلہ جنم لیتا ہے، اس لئے سنا ہے کہ انگریزوں نے اس کتاب کو ضبط کرلیا تھا۔ اس کے پڑھنے اور چھاپنے، دونوں پر سخت سزاؤں کا اعلان ہوا تھا، مگر اس کے باوجود بھی مسلمانوں کو اس سے گہرا تعلق اور اس کو پڑھنے سننے کا بڑا جذبہ تھا۔ والدہ مرحومہ نے یہ پوری کتاب اپنی والدہ (میری نانی) سے سنی تھی اور آج کے زمانہ میں کون یقین کریگا، کہ میری نانی نے اس کتاب کے کہیں دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے، اس کی پوری نقل تیار کی تھی، جو بہت بڑے، ہندوستان میں مشکوۃ وھدایہ جیسے ناپ کے آٹھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، یہ نسخہ بحمداللہ اب بھی محفوظ ہے۔ یہی نہیں بلکہ خاندان کی اور خواتین نے بھی اس کی نقلیں تیار کی تھیں، جس کو وہ اپنے اپنے گھروں میں اپنے بڑوں اور چھوٹوں کے سامنے پڑھتی، سنتی تھیں، اس کی ایک اور نقل جو میں نے دیکھی ہے، وہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کی ہمشیرہ عائشہ خاتون نے تیار کی تھی، وہ بھی اب تک موجود ہے۔

دس بارہ سال پہلے ہمارے ایک نیم مجذوب، ملنے والے صاحب نے اس سے پیدا ہونے والے جذبہ اور مؤثر پیغام کی وجہ سے، اس کی نئی طباعت کا ارادہ کیا تھا اور اس کے لئے مجھ سے چاہا کہ میں اس کے تمام عنوانات کا جو خاصے مفصل اور تین تین چار چار سطروں میں فارسی میں ہیں، اردو ترجمہ کردوں۔ میں نے ان کی خاطر یہ کام کیا اور انھوں نے کسی نہ کسی طرح اس کو کمپوز بھی کرالیا تھا، مگر مالی وسائل کے فقدان کی وجہ سے اس کی طباعت کی نوبت نہیں آئی، وہ کمپوز شدہ نسخہ اسی طرح رکھا ہوا ہے۔ اگر کوئی بڑا ادارہ یا ذمہ دار شخص اس کو شائع کرنا چاہے تو رابطہ کرسکتا ہے۔

کافی مرادآبادی) حفیظ جالندھری کا شاہنامہ اسلام(۱) علامہ راشد الخیری کی کتابیں، خصوصاً آمنہ کالال اور کمال اتاترک کے حالات پر، تیغِ کمال، نیز مخدرات عبدالحلیم شرر (اس سے بھی خاصی دلچسپی پیدا ہوئی تھی) وغیرہ دسیوں کتابیں تھیں، جو ہم نے والدہ مرحومہ سے سنیں اور والدہ ہی سے تھوڑی بہت اردو پڑھنی لکھنی سیکھی اور فارسی کی بالکل ابتدائی کتابیں، حمد باری، آمدنامہ بھی انھوں نے ہی پڑھائی تھیں۔ رحمھا اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

ہمارے گھر میں یوں تو ہمارے ہوش کے اول دن سے، بلکہ اس سے بھی پہلے سے، دین اور علم کا تذکرہ اور چرچا ہر وقت رہتا تھا، کوئی نہ کوئی بات گھر کے بڑوں اور بوڑھیوں سے کانوں میں پڑتی رہتی تھی۔ مجھے پتہ نہیں کہ یہ شوق کہاں سے لگا، مجھے اسی وقت سے مطالعہ کا، پڑھنے کا ایک چسکا لگ گیا تھا، اردو کی چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھنے کی عادت ہوگئی تھی، مگر ہم والدہ کو اس کی خبر نہیں ہونے دیتے تھے، اس لئے بہت سارے لفظ، خوب مزے میں اور بالکل غلط پڑھا کرتے تھے، تین چار باتیں اب بھی یاد آرہی ہیں۔ سہارنپور سے ایک ہفت روزہ اخبار بے باک کے نام سے نکلتا تھا، یہ اخبار سنجیدہ حلقوں میں بڑی توجہ سے پڑھا جاتا تھا، میرے تایا ابا مولانا احتشام الحسن کاندھلوی کے علاوہ، محلہ میں دو تین جگہ اور آتا تھا، میں اپنی پوری جہالت کے باوجود، اس کو بھی پڑھنے کی کوشش کرتا، جس میں استعداد کا یہ حال تھا کہ اس میں ایک مستقل کالم چھپتا تھا ''تاکہ سَند رہے'' اور ہم اپنی قابلیت میں، اس کو سُندَرُ پڑھا کرتے تھے ''تاکہ سُندَرُ رہے''۔ اپنی مزید حماقتیں اور جہالتیں یاد آتی ہیں، اسی دور میں اخبار پڑھنے کی بھی بری عادت ہوگئی تھی، حال یہ تھا کہ میں ازراہ دانشوری چیلنج (چ ے ل ن ج) کو چُلیَخ (چ ل ے خ) پڑھتا تھا، وہ تو میں کہیں اپنے ہم عمروں کی ایک محفل میں کہہ رہا تھا، کہ فلاں نے فلاں کو چُلیَخ کردیا تو ایک بڑے آگئے، انھوں نے کہا: کیا کہا؟ میں نے کمال نالائقی سے چلیخ دہرادیا، وہ اول تو بہت زور سے ہنسے، پھر انھوں نے تصحیح کی کہ یہ لفظ چُلیَخ نہیں، چیلنج ہے۔ اس طرح کے اور بھی کئی لفظ تھے، اب ان کو یہاں کیا بتایا جائے، لیکن پڑھنے کی لت لگ چکی تھی، اخبارات ہوں، رسائل ہوں، ادبی کتابیں ہوں، تحریرات ہوں، ہر ایک کے دیکھنے پڑھنے، کم سے کم ورق گردانی کی عادت سی بن گئی تھی۔

والدہ صاحبہ کی کتابوں میں بجنور کے، بچوں کے مشہور رسالہ غنچہ کے بھی کچھ شمارے تھے، ان کو بھی بار بار پڑھتا تھا اور اسی بے تکے پن میں کچھ صحیح، کچھ غلط، کہ کوئی ہماری تربیت اور رہنمائی کرنے والا تو تھا نہیں، والد صاحب (مولانا افتخار الحسن صاحبؒ وفات: ۲۷ رمضان المبارک ۱۴۴۰ھ) اکثر گھر سے باہر رہتے، ہفتوں ہفتوں کے بعد،

---

(۱) شاہنامہ اسلام اگرچہ عام طور سے چھپی ہوئی ملتی تھی اور ہمارے یہاں بھی اس کا حیدرآباد کا چھپا ہوا نسخہ تھا لیکن اس کو خاندانی مزاج کا اثر کہیے یا کتابوں کی حفاظت کا شوق، کہ شاہنامہ اسلام کی بھی دو نقلیں موجود تھیں، ایک نقل جو میری نانی صاحبہ کی بڑی بہن کے قلم سے ہے، دوسری یہیں خاندان، محلہ کے ایک شخص حافظ مسعود صاحب کے قلم سے ہے۔

ایک دو دن کے لئے واپس آتے تھے اور پھر چلے جاتے تھے اور یوں بھی ان کو میری تعلیم و تربیت یا گھر کے نظام سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں تھی۔ ہمارے لئے تو جو کچھ تھیں، وہ والدہ تھیں اور جو کچھ میں پڑھتا تھا، اس کی والدہ مرحومہ کو زیادہ خبر نہیں ہوتی تھی، وہ اپنے کرنے کے جو کام سمجھتی تھیں، اردو کا، فارسی کا کوئی سبق پڑھا دیا، تختی لکھنے پر توجہ دلا دی، ان کو کرتی رہتی تھیں۔ بہر حال اسی لا اُبالی پن میں پڑھنے کا ایسا لپکا ہو گیا تھا، کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ ہاتھوں میں اور نگاہوں کے سامنے رہتا تھا، اگر چہ سبق کی کتاب اور مدرسہ کی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہیں تھی لیکن یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا، کبھی کسی ساتھی سے مدرسہ میں، کبھی کسی اور سے کہانیوں کی چھوٹی موٹی کتابیں اور اخبار مل جاتے تھے، اس کا بڑا ذریعہ تو ایک ہندو پنساری (لالہ چمن لال) تھا، جس کی دکان جامع مسجد کاندھلہ کے دروازہ کے سامنے تھی۔

چمن کی عادت یہ تھی کہ وہ چورن اور کھٹی مٹھی گولیاں بنا کر رکھتا اور بچوں کو تقسیم کرتا رہتا تھا۔ ہم بچے دن میں کئی کئی مرتبہ اس کی دکان پر جاتے، کہتے چمن! چورن دیدے، کبھی گولی مانگتے، وہ دے دیا کرتا تھا، اس وقت اس کے یہاں اردو کا اخبار ''پرتاپ'' آیا کرتا تھا، مجھے آہستہ آہستہ اس کے دیکھنے کا مرض لگ گیا اور اُسے بھی جب اندازہ ہو گیا کہ یہ بچہ کچھ پڑھ لیتا ہے تو وہ اپنا اخبار دے دیا کرتا تھا، میں وہیں اس کی دوکان پر، لوہے کے مونڈھے پر بیٹھ کر، اسی قابلیت کے ساتھ پڑھا کرتا تھا، جس کا اوپر تذکرہ آچکا ہے۔

جب ذرا اور بڑا ہوا تو اردو ادب اور نظم و نثر کا ایک انتخاب، جس کا نام شاید توزک اردو تھا، جو اگر مجھے صحیح یاد ہے تو مولوی اسماعیل میرٹھی کی تالیف تھی، اس کا ایک بہت خراب خستہ، شکستہ نسخہ کہیں سے مل گیا تھا، اس کے ورق جوڑ جاڑ کر، اس کو بھی پڑھنے کی کوشش کی تھی، ایک اور کتاب جو اردو کی شاید پانچویں کتاب تھی، علامہ اقبال کی مرتبہ تھی، وہ بھی ہمارے گھر میں موجود تھی، اس کو بہت شوق سے پڑھا تھا اور صاف بات یہ ہے کہ بعد میں بھی پڑھتا رہا، اس کی بعض کہانیاں اور واقعات، اب تک بھی کچھ یاد آجاتے ہیں۔ اس زمانہ میں بیسویں صدی، ایک اچھا ادبی رسالہ نکلتا تھا، مجھے ہرگز اس کو سمجھنے کی استعداد نہیں تھی، مگر وہی جو پڑھنے کی بیماری تھی، اس کی وجہ سے اُسے پڑھتا، دیکھتا تھا۔ اس وقت ہمارے پڑوس میں واقع اسکول میں، ایک ماسٹر صاحب تھے، ان کے کئی ملنے والے، دلی سے ان کی پسند کی کتابیں، رسالے لاتے تھے، کبھی کبھی مجھے ان میں سے کسی کے، دیکھنے پڑھنے کا موقع مل جاتا تھا۔

اس وقت ادبی کتابیں اور رسائل بہت شوق و ذوق سے پڑھتا تھا، اس زمانہ میں ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کا طوطی بول رہا تھا، لوگ ان پر ٹوٹے پڑتے تھے، اس کا بار بار تذکرہ سنا، کئی لوگوں کے ہاتھ میں دیکھا، تو خود بھی اسے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا اور پھر جو اس کو پڑھنا شروع کیا تو اس کا کوئی شمارہ اور کوئی نئی اشاعت باقی نہیں رہی، جس کو نہ پڑھا ہو اور بعضوں کو تو کئی کئی مرتبہ پڑھا، بار بار پڑھا، میرے خیال میں سو، سوا سو شمارے تو یقیناً پڑھے ہوں گے، ممکن ہے زیادہ پڑھے ہوں اور میں اپنی کمی کوتاہی کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس کے بعض قصے اور واقعات اب تک ذہن میں ہیں۔

وہیں سے ناولوں کے پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا، اس کی بھی ایک لمبی داستاں ہے۔ نسیم انہونوی اور فیاض احمد کی تحریریں بطور خاص پسند تھیں، فیاض احمد کا ناول شمیم اور نسیم انہونوی کا عفت، اے آر خاتون کی تصویر اور شمع اور نہ جانے کس کس کی، کیا کیا الا بلا کتابیں پڑھیں، اسی دور میں نسیم حجازی کی طرف توجہ ہوئی، سب سے پہلے ان کا ناول معظم علی پڑھا تھا، پھر تلوار ٹوٹ گئی، آخری معرکہ، خاک وخون، ایک ایک کرکے تقریباً سبھی کتابیں پڑھیں۔ اس زمانہ میں جو بعض مصنفین بہت مشہور تھے، کرشن چندر، پرکاش پنڈت، مظہر الحق وغیرہ مگر ان کی کتابوں سے کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔

اسی دور میں اچھی دینی کتابوں کی طرف رجحان ہوا، جس کتاب نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی اسلام تھی، جس میں سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے احوال سادہ انداز میں لکھے ہیں اور اس میں بڑی کشش ہے۔ ایک اور کتاب، جس کو اس وقت بہت ذوق وشوق سے، اہتمام سے پڑھا تھا، جو پلے تو نہیں پڑی مگر پڑھ کر مزہ بہت آیا، وہ مولانا مناظر احسن گیلانی کی کائنات روحانی تھی، جو غالباً مجلس سلطان العلوم، دیوبند سے چھپی تھی، اس کا ٹائٹل بہت خوبصورت تھا، وہ اب بھی نگاہوں میں پھرتا ہے، یہ کتاب اگرچہ اس عمر میں پڑھنے کی نہیں تھی مگر پڑھی اور اس سے دلچسپی رہی۔ اس کے بعد تو ہر طرح کی، ہر ایک موضوع کی کتابوں کے پڑھنے کا معمول ہو گیا تھا، ذوق تو کیا کہوں، وہ تو اب بھی نہیں ہے، سینکڑوں کتابیں دیکھ ڈالیں۔

اس دور میں ہندستان میں اردو میں ڈائجسٹوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا، پاکستان سے ڈاک کے آنے جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی، اس لئے الطاف قریشی (۱) صاحب کا اردو ڈائجسٹ بھی، کہیں سے پڑھنے کے لئے مل جاتا تھا، بعد میں جب ہندوستان میں ڈائجسٹ چھپنے شروع ہوئے۔ شبستاں، ہما وغیرہ، ان کو بھی شوق سے پڑھتا تھا، یہ دور وہ ہے جب میرا مظاہر علوم میں داخلہ ہو گیا تھا، وہاں غیر درسی چیزوں کے مطالعہ پر پابندی سی تھی، یوں بھی اس وقت طالب علم عام طور سے مطالعہ کے خوگر نہیں تھے، مظاہر علوم کے قیام میں مدرسہ کے دفتر کی عمارت میں رہتا تھا اور ڈائجسٹ وغیرہ خوب پڑھا کرتا تھا اور کبھی کبھی کوئی اچھا ناول اور ادبی رسائل بھی کہیں سے مل جاتے تھے۔ اس لئے میں کوشش کرتا تھا کہ کسی کو اس کا زیادہ پتہ نہ چلے، مگر کب تک!

ہمارے استاذ اور مدرسہ کے عملاً ناظم اور صدر مدرس، مولانا مفتی مظفر حسین صاحب کے پاس شکایت گئی، مفتی

---

(۱) کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اردو ڈائجسٹ کے مدیر صاحبان (قریشی برادران) کا قدیم آبائی وطن، موضع حسین پور ہے، جو اس وقت ضلع شاملی، یوپی کا ایک حصہ اور میرے وطن کاندھلہ سے شمالی مشرق میں صرف پچیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ آخری دور کی ایک اور معروف شخصیت، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مرحوم کا وطن بھی یہی گاؤں حسین پور تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد میرے ساتھ حسین پور گئے تھے، اپنے مکان کو دیکھا تھا اور اپنے رسالہ میثاق میں اس کا سفرنامہ بھی لکھا تھا۔

صاحب نے غالباً اول اسکو نظر انداز کیا، مگر جب بار بار کہا گیا، توجہ دلائی گئی، ایک دن کئی لوگ جمع ہوکر ناظم صاحب کے پاس پہنچے اور مجلس عام میں سب کے سامنے مفتی صاحب سے کہا، اس وقت، مفتی صاحب نے مجھے طلب کیا اور فرمایا: تمہاری شکایتیں بہت ہیں، یہ تم کیا کیا پڑھتے رہتے ہو۔ میں نے کچھ عرض کیا، مفتی صاحب نے فرمایا: وہ سب چیزیں لاکر مجھے دکھاؤ، میں اپنے کمرے گیا اور اس وقت جو پانچ سات کتابیں، رسالے میرے مطالعہ میں تھے''ازراہ حماقت'' سب اٹھالایا اور اسی مجلس میں مفتی صاحب کے سامنے لاکر رکھ دیئے، مفتی صاحب نے کسی قدر ناگواری کے لہجہ میں کہا، ان کو یہیں رکھ دو، میں دیکھوں گا! میں رکھ کر چلا آیا، تین چار دن کے بعد میں وہاں سے گزر رہا تھا، مفتی صاحب نے فرمایا کہ: مجھ سے ملنا، میں حاضر ہوا، تو وہ سب کتابیں میرے حوالے کردیں، اور فرمایا کہ: پڑھ لیا کرو، مگر ان سب کے سامنے نہیں! اس دن کے بعد کبھی مجھے کسی نے نہیں ٹوکا۔

مدرسہ مظاہر علوم میں داخلہ ہوا، تو مظاہر علوم کے بہت بڑے کتب خانہ تک پہنچ ہوئی، اگر چہ مدرسہ کے کتب خانہ میں طلباء کے داخلہ اور عام مطالعہ کی اجازت نہیں تھی لیکن میں وہاں گھس جاتا تھا، مدرسہ کے کتب خانہ کے جو ذمہ دار تھے، کبھی وہ بالکل منع کردیتے، کبھی ڈانٹ دیتے اور کبھی میں موقع دیکھ کر اندر گھس جاتا، میں نے تو اتنی کتابیں، کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھیں تھیں، وہاں پہنچ کر عجیب حالت ہوئی کہ انہیں دیکھیں، پڑھیں، کیا کریں۔ آہستہ آہستہ ہمت بڑھی اور کوئی کتاب نکال کر پڑھنے، دیکھنے لگا، سنجیدہ مطالعہ کا ذوق وہیں سے ہوا، وہاں کی پچاسوں کتابیں پڑھی ہوں گی، بعض تھوڑی بہت پڑھیں اور چھوڑ دیں، بعض کو نکالا، دیکھا اور رکھ دیا۔

اگر چہ مظاہر علوم میں قانون اور معمول یہ تھا، کہ طلباء کو درسیات کی شروح اور حواشی کے علاوہ غیر درسی (خارجی) کتابیں پڑھنے کی ممانعت تھی، مگر میرے کتب خانہ میں بار بار جانے کی وجہ سے، ناظم کتب خانہ (مولانا علیم اللہ صاحب بستوی) جو میرے والد صاحب کے بھی بہت ملنے والے تھے، مجھ پر مہربان ہو گئے تھے اور ناظم مدرسہ مفتی مظفر حسین صاحب بھی بہت شفقت فرماتے تھے، اس لئے سبق کے علاوہ، میرا تمام وقت کتب خانہ میں گذرتا تھا اور برسات کے گدھے کی طرح، اناپ شناپ کبھی ادھر منہ مارتا، کبھی اُدھر منہ مارتا، جو کتاب چاہتا نکالتا، دیکھتا، رکھ دیتا۔

اسی زمانہ میں ایک حماقت سوار ہوئی تھی کہ حاجی خلیفہ کی مشہور کتاب **کشف الظنون** کو شروع سے آخر تک پڑھا جائے اور اس کی کچھ خاص باتیں قلم بند کی جائیں، اس ارادہ پر عمل بھی ہوا۔ پوری کتاب تو نہیں مگر اس کا بڑا حصہ سطر بسطر دیکھا تھا اور اس کی بہت سی یادداشتیں تیار کی تھیں، جو شاید اب بھی کہیں پڑی ہوں گی۔ اس کے علاوہ مظاہر علوم کے کتب خانہ میں اسلامی، دینی، فقہی، تاریخی، ادبی اور مختلف موضوعات پر ہزار ہا، ہزار کتابیں تھیں، میرا کوئی رہنما اور ایسا ساتھی تو تھا نہیں جو میری رہنمائی یا صحیح کتابوں کے مطالعہ میں مدد کرتا، اس لئے جس طرح جو کچھ الٹا سیدھا سامنے آتا، آدھا، تہائی، ناقص یا پورا دیکھتا، پڑھتا یا نظر ڈال لیتا تھا، یوں مطالعہ کا ذوق آگے بڑھتا رہا۔

مظاہر علوم کے کتب خانہ سے تین سال تک مسلسل استفادہ کا موقع ملا، بعد میں کتب خانہ کے ذمہ داران، شاید مجھے بھی اپنے گروپ کا ایک حصہ سمجھنے لگے تھے، اس لئے اب کوئی روک ٹوک نہیں رہی تھی، میں نے اس کتب خانہ سے اپنی معمولی لیاقت وصلاحیت کے مطابق، زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ اس کی کتابیں میرے لئے مرجع، منزل راہ اور دستاویز ثابت ہوئیں۔ اس وقت سے مولانا مفتی مظفر حسین کی وفات تک، مظاہر علوم کے کتب خانہ سے وسیع اور ہمہ گیر رابطہ رہا، اس کی مطبوعات کے علاوہ، مخطوطات نے بھی بہت فائدہ پہونچایا۔

میں شاید واحد شخص ہوں، جس نے مظاہر علوم کے ایک ایک مخطوطہ کو توجہ سے دیکھا اور اس کی خصوصیات، محاسن اور متعلقات کو جاننے کی کوشش کی تھی، یہ کام میں نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ کے ایک تحریری حکم نامہ پر، مدرسہ کی مجلس شوریٰ کی منظوری سے کیا تھا۔ میں نے اس پورے مطالعے کی رپورٹ تیار کر کے پیش کی، میں کیا عرض کروں کہ اس کو شیخ نے کس طرح پسند کیا اس کی کس قدر نہایت زوردار، تحسین تحریر فرمائی تھی، حضرت شیخ کی اس تحریر اور کلماتِ بلند پر شوریٰ کے بعض ممبروں نے زبانی اور تحریری اظہار حیرت کیا تھا کہ شیخ نے یہ اتنی بڑی بات کس طرح لکھ دی۔ بعض ممبران شوریٰ نے مجھے لکھا اور ہدایت کی کہ یہ خط اس لائق ہے کہ اس کو دستاویز بنا کر محفوظ رکھا جائے، شیخ نے جو فرمایا اور دعا دی تھی، میری بعد کی تحریرات اسی کی قبولیت کا اثر اور مظہر ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ کے موقع پر، جب مدرسہ مظاہر علوم کی شوریٰ نے اپنے اہم مخطوطات کا تعارف لکھوانے اور مہمانوں کے لئے، ان کی نمائش کا منصوبہ بنایا، اس وقت شوری کی ہدایت پر، ناظم مدرسہ مولانا مفتی مظفر حسین صاحب نے مجھے حاضر ہونے کا حکم دیا، میں نے وہاں آٹھ دس دن قیام کر کے، اپنے ناچیز مطالعہ کی روشنی میں، ان میں سے کچھ مخطوطات منتخب کیے، ان کا مختصر ضروری تعارف لکھا، جس کا (مظاہر علوم سہارنپور میں میرے ہم سبق) مولانا قاضی محمد ہارون اندوری (جو کتب خانہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے مخطوطات کے نگراں اور بعد میں ناظم بنے) نے عربی ترجمہ کیا تھا، جو ان مخطوطوں کے ساتھ کارڈوں پر درج کر کے اس تعارف کے ساتھ رکھا گیا، جو آج تک بھی اسی طرح رکھے ہیں، میری معلومات میں اس تعارف پر آج تک کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس خدمت کے صلہ میں مولانا مفتی مظفر حسین صاحب اور شوریٰ، دونوں نے علیحدہ تحریروں میں اس ناچیز کی خدمت کی تحسین اور اعتراف فرمایا اور شاید ڈھائی ہزار روپے، جو اس وقت ایک بڑی رقم تھی بطور تعاون وشکریہ ارسال فرمائی تھی، میں نے ہر چند تحریری اور زبانی اس کے وصول کرنے سے انکار کیا، مگر ان حضرات کے اصرار وہدایات کے سامنے مجبور ہو گیا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ مولانا مفتی مظفر صاحب کی حیات تک، میرے لئے مدرسہ کے کتب خانہ سے، کسی بھی چیز کا عکس وغیرہ لینے کی بالکل اجازت اور عام بات تھی، مفتی صاحب مرحوم تو قلمی کتابوں کے فوٹو کے لئے بھی کبھی منع نہ کرتے تھے اور فرمادیا کرتے تھے کہ یہ کتابیں تمہارے ہی جیسے لوگوں کے لئے تو رکھی ہیں، مگر نہایت افسوس اور رنج

ہے کہ مفتی صاحب کے بعد سے یہ بڑا کتب خانہ، جو برصغیر ہند کا بہت اہم اور نوادر کتب سے مالا مال سرمایہ ہے، نہ صرف میرے لئے بلکہ تمام ہی کتب دوستوں اور علم کے طلبگاروں کے لئے، بالکل شجر ممنوع کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اب مدرسہ کے محترم ذمہ دار، کسی کو ہی کتاب دیکھنے نہیں دیتے، مخطوطات وغیرہ کا تو تذکرہ ہی کیا ہے، مطبوعہ کی بھی، بس دور دور سے زیارت کر سکتے ہیں، براہ راست استفادہ کی بات، آج کل خواب وخیال کی بات ہے، نہ کوئی ان کا عکس لے سکتا ہے اور نہ موبائل میں کوئی صفحہ قید کر سکتا ہے۔ مجھے اس کا زیادہ افسوس یوں ہوتا ہے کہ وہاں کی سینکڑوں کتابوں کی متفرق یادداشتیں اور کتابوں کا حوالہ وتعارف میرے پاس جمع ہے، اب اس کا حوالہ دوں تو کیسے اور ان سے رجوع ہو تو کس طرح! سب طرح کی کوشش کر لی لیکن راہ کی چٹانیں ہیں جو کسی طرح ہٹنے کا نام نہیں لیتیں۔ قلل الجبال و بینهن حتوف

سہارنپور شہر میں ایک بہت پرانی لائبریری محمد علی جوہر لائبریری کے نام سے تھی، کبھی کبھی چھٹی کے وقت، خصوصا شام کو اور اکثر جمعہ کے دن وہاں جا بیٹھتا تھا، وہاں کتابوں کا اور بہتر انتظام تھا، ادبی، تاریخی چیزیں، سوانحات، تذکرے، شعروادب اور سیاسی کتابیں خاصی تعداد میں تھیں اور ایک بڑی چیز یہ تھی کہ وہاں پرانے اخبارات ورسائل کا ایک اچھا خاصا مرتب اور معقول ذخیرہ تھا، اس میں بھی ہاتھ ڈالنے اور ورق گردانی کی عادت ہوگئی تھی، جب کئی مہینے مجھے آتے جاتے ہوگئے تو وہاں کے نگراں بھی کچھ مہرباں ہوگئے تھے، وہ زیادہ روک ٹوک نہیں کرتے تھے۔

اس زمانہ میں سہارنپور سے ایک بہت اچھا اخبار "بے باک" نکلتا تھا جس کا تذکرہ آچکا ہے۔ محمد علی لائبریری کی عمارت کے ایک کمرہ میں اس کا دفتر تھا، وہاں کبھی کبھی جا کر بیٹھ جاتا تھا اور اس کے ایڈیٹر زکریا اسعدی صاحب، بڑے منجھے ہوئے ممتاز صحافی تھے، کبھی کبھی ان سے کوئی بات سننے کو ملتی تھی، وہ سیاسی تنظیموں اور دینی اداروں کی تاریخ اور شخصیات، حال اور ماضی پر گہری مبصرانہ نظر رکھتے تھے اور دونوں کی باتیں کیا کرتے تھے، جس سے بہت فائدہ ہوا۔ وہاں بے باک اخبار کے تبادلہ میں، بہت سے اخبارات اور رسالے اور کبھی کبھی کتابیں بھی تبصرے کیلئے آتی تھیں، ان کو بھی کبھی قریب سے، کبھی دور سے دیکھنے کا موقع ملتا، کبھی کبھی وہ کسی رسالے یا نئی کتاب کے بارے میں کوئی فقرہ کہہ دیتے تھے تو اس کو پڑھنے کا شوق پیدا ہوتا، مگر پڑھنے کا موقع کم ہی ملتا تھا، چوں کہ اسعدی صاحب کا دفتر میں دیر تک بیٹھنے کا معمول نہیں تھا۔

سہارنپور میں کئی چیزیں اور بھی تھیں، ان سے بھی کچھ نہ کچھ فائدہ ہوا، اس وقت خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کے ذمہ دار، مولانا ظہور الحسن کسولوی کے فرزند، مولوی نجم الحسن صاحب کا بھی مظاہر علوم میں داخلہ ہوگیا تھا اور وہ مدرسہ مظاہر علوم کے دفتر کے قریب ایک مکان میں، جو ان کے والد صاحب کے پاس ایک لمبے عرصہ سے کرایہ پر تھا اور اسی میں ان کا پرانا کتب خانہ، کتب خانہ امدادالغرباء تھا، قیام تھا۔ مولوی نجم الحسن کی تھوڑے ہی دنوں میں، سہارنپور کے بہت سے نوجوانوں اور اسکول کالج کے طلباء، بعض استادوں اور غیر مسلم باذوق وباشعور لوگوں سے دید وشنید ہوگئی تھی، ان کی یہ قیام

گاہ امدادالغرباء، ایک پنچایت گھر یا چوپال بن گئی تھی، یہاں بھانت بھانت کے لوگ آتے، طرح طرح کی باتیں ہوتیں، بحث ومباحثے، ادبی گفتگو اور سلوک وتصوف کے علاوہ، بزرگانِ دین کے تذکرے رہتے تھے۔

ان میں تین چار آدمی ایسے بھی تھے جو اگرچہ کبھی کبھی آتے تھے، مگر مطالعے سے دلچسپی اور اپنے موضوعات سے آگاہی رکھتے تھے، ان کی باتیں سننے کا موقع ملتا۔ امدادالغرباء میں سلوک وتصوف، وعظ وارشاد، خصوصا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی تصانیف اور مواعظ کے خاصے سرمایہ کے علاوہ، فارسی، اردو، ادب اور شاعری پر بھی کچھ کتابیں تھیں، ان کی بھی ورق گردانی کا موقع مل جاتا تھا۔ جس میں سفرحج کا ایک سفرنامہ، جس کا نام "اشرف السفر" تھا، موجود تھا، اس کے مؤلف مولوی رحم الٰہی سکروڈہوی تھے، تھا تو وہ بالکل سیدھا سادہ، مگر شاید مصنف کے خلوص کی برکت تھی کہ اس کو بار بار پڑھا، اسی وقت کی ایک پسندیدہ کتاب "ارواح ثلاثہ" تھی، اس کو بہت پڑھا، یہاں تک کہ اس کے اکثر حصے زبانی یاد ہوگئے تھے۔ وہیں ریاض خیرآبادی کا مجموعۂ کلام "ریاض رضوان" بھی دیکھا، اس کی طباعت وغیرہ بہت عمدہ تھی مگر ریاض کے کلام سے کبھی مناسبت نہ ہوئی۔

اس زمانہ میں ہمارے گھر پر، کاندھلہ میں تین چار رسالے آتے تھے، جو دونوں طرح کے تھے، دینی بھی اور ادبی بھی۔ میرے والد صاحب صرف دینی چیزوں کا مطالعہ کرتے تھے اور میرے تایا، ابا مولانا اظہارالحسن صاحب کو ادبیات کا بھی بہت ذوق تھا۔ والد صاحب کے پاس ماہنامہ نظام کانپور اور ایک اچھا دینی معیاری رسالہ، ماہنامہ تذکرہ دیوبند آتے تھے اور تایا ابا مولانا اظہارالحسن کے پاس ہندوستان کے بعض ادبی رسالوں کے علاوہ، لاہور سے ایک ماہنامہ اسلوب، جس کے ایڈیٹر شاید مظفرنگر کے کوئی صاحب تھے اور ایک پندرہ روزہ پیام لاہور آتا تھا جو خوبصورت سا چھپتا تھا، میں بھی اس کو دیکھ لیا کرتا تھا، تذکرہ اور نظام کے مضامین بھی پڑھتا تھا، نظام میں زیادہ طبیعت لگتی تھی۔

بڑے تایا ابا مولانا احتشام الحسن کاندھلوی، جو اس وقت کی معروف علمی شخصیت تھے، ان کی تصانیف اور مضامین چھپتے رہتے تھے، ان کے یہاں بھی کئی اخبارات خصوصا روزنامہ الجمعیۃ اور دارالعلوم دیوبند وغیرہ سے متعدد رسالے آتے تھے، میں اپنی بری عادت کے مطابق، کبھی کبھی ان میں چھیڑ چھاڑ کرلیا کرتا تھا۔ ہمارے ایک پڑوسی کے یہاں جو جماعت اسلامی سے کسی قدر متاثر تھے، پابندی سے روزنامہ دعوت آتا تھا اور وہ پتہ نہیں کیوں، مجھے پڑھنے کے لئے دے دیا کرتے تھے۔

سہارنپور کے قیام میں سب سے بڑی نعمت ودولت، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے یہاں ہر وقت حاضری کی سہولت تھی، میں گویا، اس گھرانہ کا ایک فرد تھا، شیخ الحدیث صاحب کبھی کبھی اپنے صاحبزادہ مولانا محمد طلحہ صاحبؒ سے فرمایا کرتے تھے: "ارے طلحہ! تجھے معلوم نہیں، ساری دنیا ایک طرف، جورو کا بھائی کا ایک طرف"

مولانا محمد طلحہ کی اہلیہ، میری بڑی بہن تھی، اس نسبت اور کئی قریبی رشتہ داریوں کی وجہ سے، شیخ کی قیام گاہ کچے گھر

کے زنان خانہ میں اور باہر بھی ہر وقت آنا جانا رہتا تھا۔ شیخ کی ایک خاص اور ایک طرح سے پرائیویٹ مجلس، عشاء کے بعد ہوتی تھی، جس میں وہی لوگ آتے جن کو شیخ بلواتے یا بطور خاص اجازت دیتے تھے، میرا سہارنپور قیام میں ہر دن وہاں حاضری کا معمول تھا، اگر کسی دن غیر حاضر ہوجاتا تھا تو شیخ معلوم کرتے وہ کہاں ہے؟ اور کسی کو بلوانے بھیجتے۔ اس لئے اور زیادہ اہتمام کرنا ہوتا تھا۔ اس مجلس میں جو خواصِ احباب کی مجلس تھی، ایک معمول کھانے پینے کا بھی تھا، شیخ کے گھر میں سے کچھ چیزیں آتیں تھیں، شیخ کے بعض متوسلین بھی ناشتے دان لایا کرتے تھے، بہر حال اس میں سے روزانہ کچھ نہ کچھ حصہ ملتا تھا اور بہت سی باتیں ہوتی تھیں، یہاں سب کا کیا تذکرہ کیا جائے۔

ایک بات اور یاد آتی ہے، کہ حضرت شیخ نے اپنے گھر کے تین بچوں کو امام صغانی کی **مشارق الانوار** سبقاً سبقاً پڑھائی تھی، اس جماعت میں کل تین لوگ شریک تھے، مولوی زبیر صاحب (جو تبلیغ کے بڑے ذمہ دار تھے اور نظام الدین میں رہے) اور مولوی شاہد صاحب، یہ دونوں شیخ کے نواسے بھی تھے، تیسرا یہ ناچیز راقم سطور تھا۔ شیخ اس سبق یا درس کے دوران جو کچھ فرماتے اس کو میں لکھ لیا کرتا تھا، اس سبق میں اگرچہ بعض اساتذہ اور بڑے لوگ کبھی کبھی آکر بیٹھ جاتے تھے، ویسے اس میں شرکت کی عام اجازت نہیں تھی۔ حضرت شیخ کی شفقت اور عنایات بہت زیادہ تھیں، اس کے لئے مستقل کتاب چاہیے، کس کس کا تذکرہ کروں۔

دوسری بڑی شخصیت جن کی صحبت وخدمت میری زندگی کا حاصل ہے، وہ حضرت الاستاذ حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ (شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور) کی ذات گرامی تھی۔ اگرچہ مظاہر علوم میں داخلہ کے وقت سے ہی حضرت مولانا محمد یونس صاحب سے واقفیت ہوگئی تھی اور واقفیت کیا معنی، حضرت مولانا میرے استاد تھے، میں نے مولانا سے **شرح وقایہ، قطبی** اور **مختصر المعانی** وغیرہ پڑھیں تھیں، اس لئے مولانا کی خدمت میں حاضری رہتی تھی، مولانا شفقت اور توجہ فرماتے تھے لیکن اس سال بہت زیادہ رابطہ نہیں ہوا تھا۔

تعلیم کے دوسرے سال، جب مظاہر علوم میں **مشکوٰۃ** اور **ھدایہ رابع** کے اسباق، حضرت مولانا کے سامنے شروع ہوئے، اس وقت سے مولانا کی خدمت میں حاضری بڑھ گئی تھی اور پھر تو کہنا چاہیے کہ ہر دن اس تعلق میں، حضرت مولانا کی شفقت وعنایات میں اضافہ ہی ہوتا رہا، تقریباً ہر دن حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی، جیسے جیسے اسباق آگے بڑھے، حضرت مولانا سے عقیدت ومحبت کا تعلق بھی آگے بڑھتا رہا۔ آئندہ سال دورۂ حدیث تھا، **بخاری شریف** اور **صحیح مسلم** کے اسباق، حضرت مولانا کے سپرد کئے گئے، میں بھی ان اسباق کا ایک ادنیٰ طالب علم تھا، اس نسبت سے مولانا کی خدمت میں حاضری کے مواقع بڑھتے رہے، جب جی چاہتا، جب موقع ملتا حضرت مولانا کے پاس حاضر ہوجاتا، حضرت مولانا کی شفقتوں کا عجیب حال تھا، وہ سبق کے بارے میں بہت کم معلوم کرتے تھے، ادھر اُدھر کی باتیں زیادہ ہوتیں اور یہ سلسلہ بڑھتا ہی گیا، میں تعلیم سے فارغ ہوکر گھر آگیا تھا لیکن یہ

تلمذ وعقیدت کا رشتہ اور حضرت مولانا کی توجہ اور عنایات ہر دن بڑھتی رہیں اور کیا عرض کروں کہ مولانا کی وفات تک یہی بات رہی، آخری آٹھ دس سالوں میں تو شاید کوئی اور نہیں تھا، جس کو حضرت مولانا اتنا وقت دیتے ہوں، اس قدر باتیں کرتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں ایک بالکل عامی اور حضرت مولانا علم وتحقیق کی آخری چوٹیوں پر تھے لیکن توجہ اور شفقت کا وہی عالم رہا جو چلا آرہا تھا۔

اس دور کی ایک بات اور یاد آئی، کہ جب میں ذرا چھوٹا تھا، ہمارے محلہ کے بڑوں نے ایک عوامی لائبریری قائم کی تھی، جس میں سب کی مشترکہ کوششوں سے کچھ کتابیں جمع ہوگئیں تھیں اور وہاں کئی اخبارات اور رسالے بھی آتے تھے، اس وقت میری عمر کے بچوں کا وہاں داخلہ ممنوع تھا، اس لئے اس لائبریری میں جانا تو کبھی یاد نہیں، ہاں وہاں جو اخبار آتے تھے ان میں سے ایک رنگون (برما) کا ماہنامہ استقلال تھا، ایک اخبار اور تھا جو اکثر رنگین اور سرخ رنگ میں چھپتا تھا، جس کا نام شاید دور جدید تھا، وہ کبھی کبھی کسی کے ہاتھ میں دور سے دیکھا کرتا تھا، چوں کہ ہم بچے تھے، یقیناً ہمارے بڑے ہمیں نالائق بھی سمجھتے ہوں گے، اس لئے لائبریری میں کبھی جانے کا موقع نہیں ملا، بس دور سے دیکھتے تھے۔ محلہ کے سب بڑے، عصر سے ایک پون گھنٹہ پہلے وہاں جمع ہونا شروع ہوجاتے تھے اور عصر کی نماز کے علاوہ، اکثر مغرب تک یہ نشست رہتی تھی، کتابیں بھی پڑھتے تھے اور اخبارات بھی۔

اس کے علاوہ ہمارے یہاں اور کوئی ذریعہ نہ تھا کہ وہاں کتاب پڑھتے، مگر طبیعت بہت ململاتی اور پڑھنے کو جی چاہتا تھا، اس وقت لے دے کے جن کتابوں کو میں ٹٹول سکتا تھا، تھوڑا بہت پڑھ سکتا تھا، وہ میری والدہ مرحومہ ہی کی کتابیں تھیں، ان میں سے ایک کتاب حکایات الصالحین تھی، جو اس وقت ہمارے علاقہ میں، گھروں میں اور باہر بھی کثرت سے پڑھی جاتی تھی، سب لوگ پڑھتے اور سنتے، ایک حلقہ اور دائرہ بنا کر بیٹھ جاتے، کوئی ایک پڑھتا، اس کی ترتیب وتفصیل تو اب یاد نہیں لیکن جو چند کتابیں یاد ہیں اور جنہوں نے شاید ذہن ومزاج پر اثرات چھوڑے، ان میں سے پہلی کتاب "ارواح ثلاثہ" ہے جس کا تذکرہ آچکا ہے اور جس کو پڑھنے کا مجھے شوق تھا اور ایک وقت ایسا تھا کہ گویا مجھے زبانی یاد تھی، اس وقت کے بزرگوں کے احوال وسوانح پر مشتمل کتابوں کو پڑھا، جس میں اچھی بری، معتبر اور غیر معتبر سبھی کتابیں تھیں اور ایک کتاب جس نے مجھے خاصا متاثر کیا، اسلم جیراج پوری کی "تاریخ الامت" تھی، اس کے تین چار حصے ہمارے یہاں تھے، اس کو بار بار پڑھتا تھا، ایک مجموعہ فتوح المصر، فتوح الشام، فتوح العراق کا تھا(۱) یہ کتابیں بھی

(۱) یہ تینوں عربی کتابوں کے ترجمے تھے، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اس وقت کی شاید سب سے زیادہ پڑھی جانے اور فروخت ہونے والی کتاب تھی۔ یہ بات بعد میں خاصے مطالعہ کے بعد معلوم ہوئی، کہ ان کتابوں کے مترجم مولوی شبیر حسن، ہمارے علاقہ (ضلع مظفر نگر یوپی) کے ایک دیہات، بھوکہ ریڑی کے رہنے والے تھے، ان کے بڑے بھائی، بڑے فاضل اور طبیہ کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔

باوجودیکہ سمجھ میں بالکل نہیں آتی تھیں، مگر کئی کئی بار پڑھیں اور پڑھنے میں خوب مزہ آتا تھا۔

والدہ مرحومہ کی کتابوں میں دو کتابیں اور تھیں، سیرت سید احمد شہید، تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی قدیم، تیسری طباعت کی پہلی جلد اور عبدالحلیم شرر کی مخدرات کا ایک حصہ، سیرت سید احمد شہید کا یہ حصہ والدہ مرحومہ سے بھی سنا، بعد میں خود بھی پڑھا اور خوب پڑھا اور اب تک اس سے گہرا تعلق ہے اور کہنا چاہئے کہ اس تحریک اور سلسلہ کی مشکل سے کوئی کتاب ہوگی، جس کو فکر و توجہ کے ساتھ نہ پڑھا ہو، اس پر علمی تنقیدی نظر نہ ڈالی ہو۔

اس وقت کی ایک کتاب اور یاد آتی ہے، یہ مدراس کے کسی کالج کا سالانہ مجلہ تھا، غالباً اس کا نام مخزن تھا، اس کا ٹیپو سلطان نمبر بھی والدہ صاحبہ کے پاس تھا، اس کو بھی خوب پڑھا، جس سے ٹیپو سلطان کی محبت دل میں اتر گئی تھی، گھر کرگئی تھی، اس کے بعد ٹیپو پر سب معلوم کتابیں تلاش کر کے پڑھیں۔

اس کے بعد تذکرۃ الخلیل، تذکرۃ الرشید اور اشرف السوانح وغیرہ کے کچھ حصے بالکل مکمل پڑھے، پھر آہستہ آہستہ مطالعہ کا دائرہ بڑھتا رہا لیکن ان سب کے باوجود یہاں اسے زیادہ ترقی اور مزید کتابیں ملنے کی توقع کم تھی، اگرچہ بعض گھروں میں علمی، ادبی، سیاسی اور تاریخی کتابیں بہت تھیں۔

ان ہی کتابوں کے ساتھ ساتھ تاریخ و ادب کا کچھ ذوق ہو چلا تھا، ادبی موضوعات پر جو کچھ ملتا، سب چاٹ جاتا، تاریخ جو بلاشبہ بہت وسیع موضوع ہے اور کثیر شاخیں رکھتا ہے، اس کے بہت سے عنوانات سے دلچسپی اور انسیت پیدا ہوگئی تھی۔ مناسب علمی، ادبی کتابوں کا رجحان بڑھتا رہا، تذکرے، سوانح حیات، آپ بیتیاں، سفرنامے، مکتوبات کے مجموعے اور خاکے، اردو میں مطالعہ کا خاص محور تھے، ان تمام موضوعات کی جو کتاب ملی، اس کو پڑھا، جو تحریر ہاتھ آئی اس پر نظر ڈالی، کس کس کا تذکرہ کروں، کس کا نام لوں، یقیناً ان موضوعات کی کئی سو کتابیں پڑھی ہوں گی لیکن دو تین کتابوں نے اس طرح پکڑ لیا کہ ایک زمانہ تک ان کا رسیا رہا اور ان سے کچھ نہ کچھ تعلق اب تک بھی باقی رہے۔

شاید جس کتاب نے سب سے زیادہ اثر ڈالا، وہ غالب کے خطوط کا مجموعہ اردوئے معلیٰ تھا، ایک اور کتاب جس کو بعد میں بھی برسوں تک، کوئی تحریر لکھتے وقت پڑھتا، دیکھتا تھا، علامہ سید سلیمان ندوی کے تعزیتی مضامین کا مجموعہ یادِ رفتگاں ہے، ایک اور کتاب جو نہ علمی، نہ ادبی لیکن بعد کے علمی، تحریری سفر میں بہت ہی مددگار ثابت ہوئی، ہمارے کاندھلہ کے نامور و ممتاز شاعر، احسان دانش کی تالیف "اردو مترادفات" ہے، اس کو بھی بہت دیکھا کرتا تھا۔ ایک اور کتاب، جس میں تحریر و تعبیر کا حسن، جاذبیت و کشش، حیرت و استعجاب اور محیر العقول باتوں اور واقعات کا عجیب سا اجتماع ہے، مولانا غوث علی قلندر پانی پتی کے احوال و کلمات کا مجموعہ تذکرۂ غوثیہ ہے، اس کی زبان، اس کے واقعات اور اس کا عجیب انداز، ہمیشہ دلچسپی کا سامان بنا رہا، اس کو بہت پڑھا۔

بعد میں خالص ادبی، تحقیقی چیزوں سے بھی خاصی وابستگی سی ہوگئی تھی، جو کچھ آتا تھا، پڑھ ڈالتا، مجھے حیرت ہوتی تھی

کہ ادیب اور محقق، ایک ایک عنوان پر اس قدر محنتیں کرتے ہیں اور اس کو تحقیق اور حوالوں سے ایسا مالا مال کر دیتے ہیں کہ اگر پڑھنے والے کو ذرا سا بھی ذوق ہو تو وہ اس سے بہت رہنمائی حاصل کر سکتا ہے اور فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں اول اول جن بڑے اہل قلم کو خاصی توجہ سے پڑھا، وہ پروفیسر محمود احمد خاں شیرانی کے مقالات، مولانا امتیاز علی عرشی کی مرتبہ مکاتیب غالب اور مولانا ہی کی اور بعض کتابیں تھیں، میں ان کو پڑھتا تھا تو خیال ہوتا کہ بزرگوں، علماء اور دینی موضوعات پر لکھنے والے اس اسلوب سے کیوں بیزار ہیں، وہ اپنے مراجع اور مآخذ کا حوالہ کیوں نہیں دیتے، کسی بھی بات کے مختلف پہلوؤں کا اندازہ کر کے، اس میں ایک رائے اور قول فیصل کیوں نہیں طے کرتے۔ شاید یہی خیال تھا جس نے اس انداز میں لکھنے کی تحریک کی مگر لکھتا کیا، ہمارے یہاں اس کا کوئی ماحول ہی نہیں تھا، کوئی حوصلہ افزائی کرنے والا، کوئی کلمہ خیر کہنے والا نظر ہی نہیں آتا تھا، صرف ایک میرے بڑے تایا (والد کے بڑے بھائی) مولانا احتشام الحسن صاحب تھے، جو میری حوصلہ افزائی فرماتے تھے لیکن میری فراغت کے ایک سال بعد ہی ان کی وفات ہوگئی تھی، اس لئے یہ دروازہ بھی بند ہوا۔

مولانا احتشام الحسن صاحب نے غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، جس کی ان کو بڑی لگن اور کڑھن تھی، اس مقصد کے لئے مختلف مقامات کے سفر کرتے اور وہاں کے علماء وعوام سے ملتے اور ان کو بھی غیر مسلموں میں تبلیغ کے لئے تیار کرنے کی کوشش کرتے تھے، اسی سلسلہ میں ایک سفر ندوۃ العلماء، لکھنؤ کا بھی ہوا تھا۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ مولانا کو لینے کے لئے خود اسٹیشن پر آئے تھے، اس وقت گاڑیوں اور آٹو رکشہ وغیرہ کا چلن نہیں ہوا تھا، اس لئے اسٹیشن سے ندوہ تک کا سفر تانگہ میں ہوا تھا، لکھنؤ پہنچ کر ایک ہفتہ تک ندوہ میں، مولانا محمد منظور نعمانی کی خدمت میں اور رائے بریلی رہنا ہوا، میں بھی مولانا احتشام الحسن صاحب کے ساتھ لگا رہتا تھا اور مولانا ابوالحسن علی ندوی سے طرح طرح کے، الٹے سیدھے سوالات کرتا رہتا تھا، حضرت مولانا ان کے جوابات عنایت فرماتے تھے، میں نے ایک سوال کیا تو مولانا نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے اندر یہ شبلویت کہاں سے آگئی؟ بالآخر بقول غالب:

مانہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب   شعر خود خواہش آں کرد، کہ گردد فن ما

میری ناچیز تحریر و تالیف کی روداد یہ ہے کہ میں جب بہت چھوٹا تھا، یہاں کاندھلہ میں جامع مسجد میں مدرسہ میں پڑھتا تھا، اس وقت یوں ہی ایک دو بیکار سی، مختصر سی تحریریں لکھی تھیں، جن کو ہم جولیوں نے پسند کیا تھا، اس کے بعد مظاہر علوم کے زمانہ تعلیم میں، مولانا عبدالماجد دریابادی کے مشہور اخبار صدق جدید لکھنؤ میں، ایک بحث میں۔ حصہ لیتے ہوئے ایک مراسلہ بھیجا تھا، جس کو مولانا دریابادی نے ازراہ کرم شائع کیا تھا، مولانا کا بڑا پن اور نہایت خورد نوازی تھی کہ اس ناچیز تحریر کو پسند فرمایا! ایسے ہی ایک موقع پر ایک مراسلہ اور لکھا تھا، وہ بھی صدق میں شائع ہوا تھا، مگر اس کا کسی طرح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کو پتہ چل گیا تھا تو شیخ ناراض ہوئے کیوں لکھا، اس لئے پھر کچھ اور لکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

تعلیم سے فراغت کے کئی سال بعد معلوم نہیں کس حماقت یا ذہنی کیفیت میں مبتلا، دو مضمون لکھے، ان میں سے ایک ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کو، دوسرا جو سرسید احمد کی زندگی اور تعلیم کے بعض نادر ترین پہلوؤں پر مشتمل تھا، ماہنامہ آج کل دہلی کو بھیجا، یہ فقط فضل الٰہی تھا کہ دونوں تحریریں، دونوں رسالوں میں بلا تاخیر، پہلے شمارہ میں شامل اور شائع کی گئیں۔

سرسید احمد والے مضمون پر، اول مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا اور اس کے ساتھ ہی پروفیسر مختار الدین احمد کا پسندیدگی کا خط ملا، جس میں انھوں نے مضمون کو سراہا تھا، پروفیسر مختار الدین احمد علم کی دنیا اور تاریخ وادب میں جس مرتبہ کے آدمی تھے، مجھے اس کا تھوڑا سا علم تھا، مختار الدین صاحب کے خط سے جو خوشی ہوئی، وہ آج تک یاد ہے، ایسی مسرت کم لوگوں کی تحسین وتحریر سے ہوئی، اس وقت سے مختار الدین احمد صاحب سے ان کے آخر زمانۂ حیات تک مستقل رابطہ، ملاقات اور خط وکتابت رہی۔

یہ دونوں مضمون تو یوں ہی بغیر کسی خیال کے لکھ دیئے تھے، اس کے بعد بہت دن تک کچھ لکھنے کا موقع نہیں ملا، کیوں کہ میرا اصل اور بنیادی طبعی ذوق فقہ وفتاوی کا تھا، فقہی کتابوں اور مؤلفات ورسائل کو خوب پڑھتا بھی تھا، مگر اس بات کا کوئی موقع ہی نہیں تھا کہ میں اس موضوع پر کوئی اظہار خیال کر سکتا یا کسی موضوع پر تجزیاتی تحریر لکھ سکتا، کیوں کہ میرے والد صاحب اس بارے میں بہت ہی سخت اور بے لچک تھے۔ میری ایک بہت چھوٹی سی تحریر، ایک صاحب کی چھوٹی سی تالیف میں چھپی تھی، جو مشکل سے تین چار صفحے تھے، اس میں میں نے مسافت قصر کے بارے میں، اپنے بعض بزرگوں کی خاص رائے اور عمل کا اظہار کیا تھا، اس کو پڑھ کر میرے والد صاحب اس قدر ناراض ہوئے، اس قدر ناراض ہوئے کہ کوئی حد نہیں رہی، ہفتوں ناگواری کا اظہار کرتے اور سخت کلمات کہتے رہے کہ آخر تو نے لکھا کیوں؟ ایسے میں کسی فقہی مسئلہ یا عنوان پر سوچنا اور لکھنا دونوں خطرے سے خالی نہیں تھے، اس لئے فقہی کتابوں، مباحث کا مطالعہ تو ہمیشہ دل پسند موضوع رہا، اردو، عربی میں جو بھی ملا، یا اب تک ملتا ہے اسے پڑھتا ہوں اور استفادہ کی کوشش بھی کرتا ہوں لیکن مذکورہ بالا دونوں مضامین کی اشاعت کے بعد توجہ تاریخ، شخصیات، مخطوطات اور بعض ادبی موضوعات کی جانب ہوگئی تھی، اس پر قلم کا یہ ضعیف ونحیف سا مسافر گرتا پڑتا سا چلتا رہا۔

یہاں ایک بات یاد آئی کہ میں نے عزیزم مولوی اسحاق حسینی مرحوم (برادر مولانا سلمان الحسینی، استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کے کہنے پر حضرت مولانا علی میاں کے بڑے بھائی، مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنی پر ایک تحریر لکھی تھی، جس کو مولوی اسحاق شائع کرنا چاہتے تھے، مگر معلوم نہیں کس طرح اس کا تذکرہ حضرت مولانا علی میاں ندوی کی مجلس میں پہنچا، مولانا نے بھی اس کو پسند کیا اور شاید حضرت مولانا کی زبانی مولانا محمد منظور نعمانی کو بھی اس کا علم ہوا، مولانا نے اس کو منگا کر دیکھا اور فرمایا کہ میں اس کو اپنے ماہنامہ (الفرقان) میں شائع کروں گا، چنانچہ وہ دو تین قسطوں میں الفرقان میں چھپا، مولانا نعمانی نے الفرقان کی وہ اشاعتیں ناچیز کو ڈاک سے بھیجیں اور اس تحریر پر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا اور اس

کے کچھ دنوں کے بعد، حضرت مولانا کا گرامی نامہ صادر ہوا، جس میں الفرقان کے لئے مضمون کی ہدایت تھی۔اس کے بعد تو الفرقان سے ایسا تعلق جڑا جواب تک ماشاء اللہ برقرار ہے، میں نے الفرقان کے لئے بیسیوں مضامین لکھے، ایک مضمون کے علاوہ سبھی الفرقان میں چھپے۔

حضرت مولانا کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ وہ ہر مضمون کی اشاعت کے بعد عموماً دوسو روپے دعوت کے نام پر ارسال فرماتے تھے اوراس کے ساتھ ایک تحریر بھی ہوتی تھی، اس معمول میں کم تخلف ہوا۔اس کے بعد ادھرادھر مختلف تحریریں اور مضامین چھپتے رہے، یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے لیکن ترجیح اس وقت بھی تازہ مطالعہ کو ہے، خصوصاً نادر وغیر مطبوعہ کتابوں کی محقق اشاعتوں کے مطالعہ کی نسبتاً زیادہ کوشش کرتا ہوں، اکابر علماء کے اہم تذکروں اور مخطوطات کی فہرستوں سے بھی دلچسپی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ سے عصر حاضر تک، خصوصاً خاندان ولی اللّٰہی اور بعد کے سلسلوں کے ممتاز ترین علماء، محدثین، فقہاء، مشائخ کرام اور جہادو آزادی کی تحریکات کے متعلق معلومات اور مطالعہ سے بحمد اللہ تعالی آج بھی ویسا ہی تعلق اور نسبت ہے، ان کے مطالعہ اوران سے متعلق چیزوں کو سمجھنے کو ترجیح دیتا ہوں اور جو تھوڑی بہت کوشش ان کے احوال وآثار کی تحریر کی ہوسکتی ہے، اس کی تدبیر کرتا ہوں۔

احمد شاہ ابدالی سے موجودہ دور تک، برصغیر کی مسلم سیاست، ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک برپا، جملہ مسلم وغیر مسلم تحریکات، تنظیموں اور تحریرات سے بھی دلچسپی ہے، اس کا بھی ایک اچھا ذخیرہ بحمد اللہ میرے پاس محفوظ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تحریک خلافت وتحریک شیخ الہند کے آغاز سے ۱۹۴۷ء تک کے جملہ احوال کی ایک، منصفانہ و دیانت دارانہ، ایسی مبسوط جامع تاریخ لکھی جائے، جس میں واقعات وحقائق کو صحیح آئینہ میں، جوں کا توں پیش کیا جائے، کیوں کہ میرا خیال ہے کہ ان موضوعات کے ساتھ بہت کم کسی نے انصاف کیا ہے، تقریباً ہر جگہ عدم توازن اور ایک خالی پن نظر آتا ہے، اس کی تیاری تو خاصی کی تھی مگر لکھنے کا موقع نہیں ملا، اب نہیں کہا جاسکتا کہ یہ خیال عمل میں آسکے گا یا نہیں۔

میری ناچیز دلچسپی کے موضوعات میں سے ایک موضوع کاندھلہ، کیرانہ، جھنجھانہ، بڈھانہ، تھانہ بھون، لوہاری، جلال آباد، ضلع مظفرنگر وشاملی کی تمام بستیوں، قصبات اور علاقے، یہاں کے تمام علما، مشائخ، اہل کمال، اصحاب شعر و ادب اوراہل سیاست اور یہاں کی قدیم تاریخ، ہر اک دلچسپی کا موضوع ہے۔اس پر بھی بہت کچھ جمع کر رکھا ہے، اب اس کی ترتیب کا کام شروع کیا ہے، دیکھئے کیا ہوتا ہے! اگر ذہنی منصوبہ کے مطابق یہ تمام معلومات اور مجموعہ مرتب ہوگیا تو امید ہے کہ بہت مفید چیز ہوگی، جو چار پانچ جلدوں میں آسکتی ہے۔اس مقصد کی توسیع اور تکمیل اور متعلقہ چیزوں کی حفاظت واشاعت کے لئے، ایک مجلہ احوال وآثار کے نام سے جاری کیا تھا، جس کے کل ۲۲ رشمارے چھپے، قارئین کی کمی اور مصارف کی کثرت کی وجہ سے مجبوراً اس کی اشاعت بند کردی گئی۔

برائے نام سی دلچسپی قلمی کتابوں سے بھی ہے، ان کا حاصل کرنا، خریدنا، ان کی حفاظت وصیانت کی فکر کرنا، ان کے متعلقات کو جاننا سمجھنا، یہ بھی کام کسی درجہ میں بحمداللہ ہوا ہے اور بفضلہ تعالی میرے ذاتی ذخیرہ میں اس وقت سترہ سو سے زائد مخطوطات ہیں، جس میں اعیان امت اور رہنمایان علم کے خودنوشت نسخوں سے، قریبی دور کے علماء، اہل قلم کی ہر طرح کی چیزیں محفوظ ہیں۔

تقریباً بیس ہزار مطبوعہ کتابیں اور اخبارات ورسائل کی تیس بتیس الماریاں ہیں، جو سب اہل علم کے لئے گویا وقف ہیں۔ ان سب کے علاوہ ایک بہت بڑا ذخیرہ، حضرت شاہ ولی اللہ سے موجودہ دور تک کے علماء، اس خطہ کے جملہ اعیان و مشائخ، سلسلۂ امدادیہ، دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور اور اکثر اعیان کے علمی آثار، خطوط، فتاویٰ، خودنوشت تحریروں وغیرہ کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی نے تحریر فرمایا تھا:

''اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ کے سلسلے کے جبال علم وعمل کے مآثر اور ان کے بارے میں معلومات کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہے کہ شاید پورے برصغیر (بلکہ شاید پوری دنیا) میں اس کی کوئی نظیر نہ ہو۔

اس ذخیرہ میں خاندان ولی اللّٰہی، اکابر دیوبند وسہارنپور، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی اور ان کے معاصرین وخلفاء کی کتابوں کے قلمی اور نادر ونایاب نسخے، ان حضرات کے مکاتیب اور دوسری مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریریں، اس اہتمام کے ساتھ جمع کی گئی ہیں کہ دوسری جگہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔''

(قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال وآثار وباقیات ومتعلقات، تالیف: نورالحسن راشد کاندھلوی، طبع سوم ۱۴۳۶ھ (۲۰۱۴ء) کاندھلہ)

میری چوبیس پچیس کتابیں چھپیں ہیں، دس پندرہ تیار ہوکر اشاعت کی لائن میں لگی ہوئی ہیں، دیکھئے چھپنے کا موقع آتا ہے کہ نہیں۔ میں اپنی اس لن ترانی اور خودستائی نامہ کو بس یہیں ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

خدا کرے اس میں کسی کے لئے کوئی سبق اور خیر کا پہلو ہو، ورنہ: کالائے بد بریش خاوند!

فقط

نورالحسن راشد کاندھلوی

Mufti Elahi Bakhsh Academy

Maulviyan, Kandhla. Distt.Shamli (Muzaffar Nagar)۲۴۷۷۷۵ (U.P) India

Mb:+۹۱-۹۳۵۸۲۶۶۷۲۱۹ **E-mail**:nhrashidkandhlavi@yahoo.com